یروشلم سے متعلق یہودی ادعائے ملکیت کا علمی و تحقیقی جائزہ

A Research Overview of Jewish Claim of Ownership Regarding Jerusalem

ضیاءاللہ خان جدون[i] ڈاکٹر مشتاق احمد[ii]

Abstract

Jerusalem is a sacred and desputed area amongst the Jews, Christians and Muslims. Jews, Christians and Muslims are with their own viewpoint with regard to its possession, since 1948, this Holy City is in the control of Jews. The occupying force i.e Isrāīllists opinions that Jerulalem is the place of their forefathers and they are the legal heir to this Holy place. Since 1948 they have controlled all the Jerusalem and the almost area of Palestine. The Jews have their claim of Greter Isrā,īl. Similarly the Christians are of the opinions that being the birth place of Ḥaḍrat Messiaḥ, Jerulsalem is the city of Christians. It is a ground reality that alongside of the Wall of Hcikal "Daware- Garya" there is located the Church of Christains. Beside this, the Muslims who were replaced by the migrated Jews are the permanent inhabitansts of Jerusalem. The Holy Prophet of Islam S.A.W dring his journey of ascending came to this Holy Place Mosque of Aqṣa" and led the prophets by prayer. In the time of Ḥaḍrat 'Umar R.A Caliphate, this place was conquered by Muslims forces and then oweners of the mosque, the Christians voluntarly handed over the keys of the Mosque. Afterwords, in the era of Ṣalāh ud Dīn Ayūbī, it was again controlled by the Muslim troops. After the 2nd world war ended the world forces decided to gather the Jews who were dispersed in the world in Juraselem and hence they settled here under a treaty. Since then their occupation in Palestine is prevailing. The almost 95% of Palestine land is In the control of

i پی ایچ-ڈی ریسرچ سکالر، ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک سٹڈیز، یونیورسٹی آف پشاور

ii ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز، قرطبہ یونیورسٹی، پشاور

Isrᾱ,īl. This article shall explore the facts that among three comnnunities i.e Jews, Christians and Muslims being with their own stand of possession whoever is legal with respects to their arguments and reality.

Keywords: Jerusalem, Jewish Claim of Proprietorship, Muslim, Isrᾱ,īl, Christian

تمہید:

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس مقدس سرزمین پر بہت ساری لڑائیاں ہوئیں۔ جس کے نتیجہ میں کئی بار یہ شہر نیستی کا شکار بنااور کئی بار ہستی کا موجب، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عموماً بہت کم عرصہ تک اس مقدس شہر نے امن و شانتی کا نظارہ دیکھا۔ پہلے یہودیوں کی کارستانیوں کا مرکز رہا پھر اہل بابل، ایرانیوں اور رومیوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ پھر مسیحیوں نے ایک عرصہ یہاں پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے اور ایک عرصہ تک اس پر مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ تاہم کسی ایک مذہب کے پیروکاروں کے قبضے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ ان کا حق ہے اور نہ ہی اس طریقے سے اس مسئلے کو حل کیا جاسکتا ہے، کیونکہ جنگ کسی بھی قضیے کا حل نہیں ہے۔ عصرِ حاضر میں اس مسئلے نے تو ایک عجیب رخ اختیار کر لیا ہے اور اب حال یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کا خصوصاً اور پوری دنیا کا امن عموماً اس قضیہ سے وابستہ ہو گیا ہے۔ حال ہی میں جب سے امریکہ نے اس شہر بیت المقدس (یروشلم) کو اسرائیل کا دارالخلافہ قرار دے دیا ہے تب سے اس مسئلہ نے دنیا کے حالات پر متاثر کن اثرات ثبت کرنا شروع کر دیئے اور یوں بعد ازاں استحقاقِ یروشلم کا یہ مسئلہ پوری دنیا کے لئے توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔

اس مقدس شہر کے بارے میں مذکور تینوں سامی مذاہب (یہودیت، عیسائیت اور اسلام) کا دعویٰ ہے کہ یروشلم پر ان کا تاریخی، دینی و قانونی حق ہے۔ اس پر یہ تینوں اپنے دلائل پیش کرتے ہیں، لیکن بد قسمتی سے گزشتہ ستر برسوں سے یہاں پر یہودیوں نے مسیحیوں کے بل بوتے زبردستی قبضہ جما کر اس کو صرف اپنا حق گردان لیا ہے۔ کیونکہ یہ ان کے لیے بزعم خویش ارض موعودہ ہے، جہاں پر وہ کسی بھی غیر یہودی کو کسی بھی قیمت چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ جابرانہ و ظالمانہ رویہ اپنا کر اب وہاں سے یروشلم کے ان اصل باسیوں (فلسطینی عوام) کو باہر نکال رہے ہیں، جو صدیوں سے یہاں آباد تھے۔ یہود اسی ریاست میں کسی کا حق تسلیم نہیں کرتے، اور کلیتاً غیر یہودیوں کے یہاں سے انخلاء کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے اس قابضانہ عمل اور ان کے لیڈروں کے بیانات سے اس کا پتہ لگتا ہے۔ سابق اسرائیلی وزیر اعظم مینکیم بیگن نے اس حوالے سے اپنا بیان ریکارڈ کرایا کہ؛

> "ہمارا موروثی وطن ناقابل تقسیم ہے، اسے ٹکڑے ٹکڑے کرنا صرف نامعقول ہی نہیں بلکہ ایک مجرمانہ فعل بھی ہے، ہم اپنے وطن کی تقسیم کبھی قبول نہیں کریں گے [1]۔"

اس بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یروشلم پر وہ اپنے علاوہ نہ مسلمانوں کا حق تسلیم کرتے ہیں اور نہ مسیحیوں کا، اس لئے استحقاق یروشلم کے بارے میں صرف یہودی مذہب کے تصورات کو ان کے بنیادی مصادر سے تحریر کر کے، بعد میں اس کا تنقیدی تجزیہ بھی پیش کیا جاتا ہے، تاکہ دیکھا جائے کہ ان کے اس دعویٰ میں کتنی صداقت اور اثبات ہے۔ یہ ایک اہم موضوع ہے جس پر ابھی تک کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔

یروشلم کا مختصر تاریخی پس منظر

یروشلم کا لفظ اوّلا عبرانیوں نے استعمال کیا۔ ابتدائی نام اس کا سالم تھا، جو ایک کنعانی دیوتا کا نام تھا[2]۔ عہد نامہ جدید سے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور ملک صدوق کی گفتگو کے دوران بھی آیا ہے جہاں ملک صدوق کو سالم کا بادشاہ بتایا گیا ہے[3]۔1400ق م میں اسے یوروسلیم (Urusalim) کہا جاتا تھا[4]۔ عبرانی بائبل میں یہ لفظ سب سے پہلے کتاب یشوع میں استعمال ہوا ہے جہاں اس کے لہجے یروشالیم (Yerushalayiam) ہیں[5]۔ جبکہ کتاب عزرا میں اس کے ہجے یروشلم (Yarushalem) لکھے گئے ہیں[6]۔ سریانی زبان میں اسے اوروشلیم (Urishalem) کہا گیا ہے۔ جبکہ ہفتاوی ترجمہ میں اسے ہیروسلیم (Hierousalem) بتایا گیا ہے۔ ہیرویوں کے زمانہ میں 135ء میں رومیوں نے اس کا نام ایلیا کیپیٹالنا (Aelia Capitalina) رکھا[7]۔ یروشلم کے جتنے نام ہیں، اور زمانے کے تغیر سے اس میں جس قدر تبدیلی آئی ہے اس کے باوجود اس کا معنیٰ ان مختلف زبانوں میں " سلامتی کے شہر" سے کیا گیا ہے۔[8]

کتاب مقدس میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے اللہ کی طرف سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اللہ کنعانیوں کی سرزمین ان کی نسل کو دیں گے، تب حضرت ابراہیمؑ نے بڑے بیٹے اسماعیلؑ اور اس کی ماں ہاجرہ کو وادی فاران میں چھوڑ کر واپس کنعان کی سرزمین میں آ گئے۔ کتاب مقدس میں اسے آرام کا علاقہ کہا گیا ہے[9]۔ یہودیت کے دینیاتی ادب میں عموماً ارض موعودہ[10] کے نام سے یہ خطہ موسوم ہے۔ ارض موعودہ کی دو توجیہات یہودی دینیات میں پائی جاتی ہیں۔ ایک توجیہ جو عموماً کتاب پیدائش کی اساس پر کی جاتی ہے جہاں آج کل یروشلم واقع ہے[11]۔ دوسری توجیہ کتاب گنتی کی اساس پر قائم ہے جب حضرت موسیٰؑ نے صحرائے سینا میں خانہ بدوش اسرائیلی قبائل کو حکم دیا کہ وہ دریائے اردن کے اس پار جا کر اس زمین پر قبضہ کریں جو ان کی میراث ہے[12]۔

علاوہ ازیں اس عظیم شہر کے بہت سارے نام ہیں۔ پرانے عہد نامے میں یروشلم کا نام ایوب، ہوسیع، یوحنا، ناحوم، حبقوق اور حجی کی کتب کے علاوہ باقی تمام کتب میں 600 مرتبہ آیا ہے[13]۔ نئے عہد نامہ میں یروشلم کا نام اعمال کی کتاب کے بعد بہت کم آتا ہے۔ رومیوں کے خط کے آخر میں 4 مرتبہ[14]، ایک مرتبہ کرنتھیوں کے پہلے خط[15] اور گلتیوں کے خط میں 4 مرتبہ یہ نام آیا ہے[16]۔ اس کے علاوہ اس شہر کا جو نام سب سے زیادہ کتاب مقدس میں ملتا ہے وہ ہے "صیہون"

یہ نام قدیم عہد نامہ میں 100 مرتبہ آیا ہے، پہلی بار سلاطین میں آتا ہے[17]۔ کتابِ مقدس میں اس شہر کے دیگر ناموں میں سے خدا کا شہر[18]، داؤد کا شہر[19]، خداوند کا شہر[20]، خداوند کا پہاڑ[21]، رب الافواج کا پہاڑ[22]، مقدس پہاڑ یا کوہ مقدس[23]، اسرائیل کے قدوس کا صیہون[24]، میرا کوہ مقدس[25]، شہر مقدس[26] جیسے نام مذکور ہیں۔ اسلامی مصادر میں سے قرآن کریم نے یہ شہر اور اس کے گردو پیش علاقے کو ارضِ مقدسہ اور ارضِ مبارکہ سے موسوم کیا ہے، قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

يَاقَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ[27]

کتب احادیث ﷺ میں اس شہر کے لیے لفظ "ایلیاء" مذکور ہے[28]۔ گویا پیغمبر اسلام ﷺ نے جو یہ لفظ استعمال کیا تھا، یہی ایلیا آپ ﷺ سے چار صدی پیشتر اس شہر کا نام پڑ گیا تھا۔ مسلمان اس کو "بیت المقدس" اور "القدس" بھی کہتے ہیں[29]۔ حضرت عمرؓ نے 17ھ/638ء میں اس شہر کو فتح کیا تو جا کر جس جگہ نماز پڑھی تھی بعد میں اسی جگہ پر مسجد اقصیٰ تعمیر ہوئی[30]۔ جب اسلامی فوجوں نے یروشلم کا محاصرہ کیا تو اس وقت یروشلم مسیحی روم کے زیر تسلط تھا اور یہودی اس کے اندر محکومانہ زندگی گزار رہے تھے۔ محصور مسیحیوں نے مسلمانوں پر یروشلم کے دروازے کھولنے کی اس شرط پر آمادگی ظاہر کی کہ خلیفۂ اسلام خود آکر ان کے ساتھ مذاکرات کریں، چنانچہ خلیفہ اسلام حضرت عمر بن خطابؓ نے خود یروشلم کا سفر اختیار کیا اور محصور مسیحیوں کے ساتھ سیاسی معاہدے کیے۔ اس دوران یروشلم میں بسنے والے یہودیوں کو کسی بھی جگہ شریک و فریق معاہدہ کے طور پر نہیں رکھا گیا۔ کیونکہ اس وقت یروشلم کے یہودی وہاں کلیدی حیثیت (Stick Holder) کے طور پر نہیں رہ رہے تھے۔ شہر کے پادری نے خلیفہ کو کلیسہ کے اندر نماز پڑھنے کی دعوت دی تاہم خلیفہ نے اسے مناسب نہیں سمجھا کیونکہ کلیسائیں مسیحیت کی مخصوص عبادت کے لیے تعمیر کی جاتی ہیں اس کے بجائے حضرت عمر بن خطابؓ نے کھلے میدان میں مصلّیٰ بچھا کر نماز ادا کی اور پھر یہی جگہ بعد میں مسجد اقصیٰ کے نام سے دنیا بھر میں متعارف ہوئی۔ خلیفہ کی جائے نماز کو مسجد اقصیٰ سے تعبیر کرنا اس قرآنی نسبت کے حوالے سے ہے جہاں اللہ نے واقعہ اسراء و معراج میں خود اس مقام کو مسجد اقصیٰ سے موسوم کیا ہے کیونکہ قرآن کے اندر یروشلم اور اس کے مترادف دیگر نام موجود نہیں ہیں تاہم قرآن دیگر مقامات پر کبھی کبھی اسے "ارض مقدسہ" یا "ارض مبارکہ"[31] کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

یروشلم اور یہودی تاریخ

یروشلم کا موجودہ جدید شہر اپنے پیچھے ایک بدویانہ تاریخی پس منظر رکھتا ہے۔ یہودیت کا کہنا ہے کہ بائبلی روایات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ہجرت کرتے وقت یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اس علاقے جو عموماً کنعانی علاقہ کہلاتا تھا، اس کی اولاد کو بطور وراثت اور بطور ملکیت عطا کرے گا۔ اس ضمن میں بائبل میں حضرت ابراہیمؑ کیساتھ کیا گیا خدائی وعدہ ہے، کہ میں اپنے اور تمہارے درمیان اور تمہارے بعد تمہاری نسل کے درمیان ان کی تمام پشتوں کے لیے اپنا وعدہ جو ابدی

عہد ہو گا، باندھوں گا تاکہ میں تمہارا اور تمہارے بعد تمہاری آنے والی نسلوں کا خدا رہوں گا۔ اور میں تم کو اور تمہاری نسل کو کنعان کا پورا ملک جس میں تم اجنبی ہو ایسا دوں گا کہ وہ ملک دائمی تمہاری ملکیت ہو جائے[32]۔

اس سے پہلے کے ابواب میں بھی بائبل حضرت ابراہیمؑ کا اپنی جائے پیدائش اور کنعان جانے کے بارے میں ذکر کرتا ہے۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ کا خاندان پہلے حاران میں مقیم ہوا اور اس کے بعد حاران سے ترک مکانی کر کے کنعان کی طرف روانہ ہوا، جہاں کنعان میں حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ کی پہلی قربان گاہ بنائی۔ چنانچہ بائبل میں ہے:

" اور تارح نے اپنے بیٹے ابرام کو اپنے پوتے لوط اور اپنی بہو سارا کو جو اس کے بیٹے ابرام کی بیوی تھی، ساتھ لیا اور وہ سب کسدیوں کے کنعان جانے کے لیے نکل پڑے۔ لیکن جب وہ حاران پہنچے تو وہیں بس گئے[33]۔"

بائبل کے مطابق خداوند نے ابرام کو حکم دیا، کہ تم چلے جاؤ اس ملک میں تم کو دکھاؤں گا، اور تم کو بڑی قوم بناؤں گا اور تم کو برکت دے دوں گا، تمہارے نام کو اونچا کرونگا، ابرام اس ملک میں سفر کرتا ہوا سکیم میں اس مقام پر پہنچا جہاں مورہ کا شاہ بلوط کا درخت تھا۔ ان دنوں اس ملک میں کنعانی لوگ رہتے تھے، اس وقت ابرام کو خداوند دکھائی دئے اور کہا: میں یہ ملک تیری نسل کو دوں گا۔ چنانچہ اس نے وہاں خداوند کے لیے جو اسے دکھائی دیا تھا، ایک مذبح بنایا[34]۔

بنی اسرائیل کا اولادِ اسماعیل سے بیر کی وجہ

تورات کی رو سے یہ بات یہود کو معلوم ہے کہ خاتم الانبیاء ﷺ ہمارے دادا حضرت اسحاق کے اولاد سے نہیں بلکہ حضرت اسماعیلؑ سے ہوں گے[35]، اس لیے پیش بندی کے لیے انہوں نے حضرت ہاجرہ پر بہتان باندھے اور حضرت اسحاق کی حضرت اسماعیل پر فضیلت و برتری ثابت کرنے کی کوشش کی۔ یہودی نسل چونکہ حضرت اسحاقؑ سے ہے اور قریش کا تعلق حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سے ہے، اس لیے یہ کبھی کبھار اپنی برتری کا اظہار کرتے اور چونکہ انہوں نے کتاب مقدس میں تحریف کی تھا اس لیے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کو حضرت اسحاقؑ سے منسوب کر لیا تھا[36] تاہم تعمیر کعبہ جو کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے ہاتھوں انجام پائی تھی اور وہاں قریش کا بسیرا تھا، اس لیے اس کا انکار ان کے لیے ممکن نہ ہو سکا، تبھی تو انہوں نے اس خانۂ خدا کا احترام نہ کرنے کی ٹھان لی تھی اور جب ان سے اور کچھ نہ بن سکا تو اپنی طرف سے حضرت اسماعیلؑ کی والدہ ماجدہ کے بارے میں ایک داستان گھڑ لی کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی نہیں بلکہ لونڈی تھیں[37]، جنہیں بقول ان کے وہ اپنی بیوی سارہ کی ایماء پر نکال کر بے آب و گیاہ ریگستان میں مرنے کے لیے چھوڑ گئے تھے، کیونکہ ان کا ماننا ہے کہ خدا نے بھی حضرت ابراہیمؑ سے یہی کہا تھا کہ سارہ کی بات مان لیں اور حضرت اسماعیل اور ان کی والدہ کے باعث برا نہ مان اور جو سارہ کہتی ہے، وہی کر، کیونکہ اسحاق کی اولاد سے میں نے تیری نسل کو آگے چلانا ہے[38]۔ یہ جو اولاد اسماعیل ہے تو یہ "لونڈی" کی نسل سے ہیں[39]۔ سوان کا کہنا ہے کہ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیسے لونڈی کی اولاد سے ہو سکتا ہے؟ لہٰذا یہ حق

صرف اولاد اسحاق کو حاصل ہے۔

یہ داستان ان جعلی روایات کا حصہ ہے جو یہودیوں نے اپنی مخصوص ذہنیت کے تحت الہامی کتابوں میں اضافوں کے ذریعے شامل کی تھیں۔ حالانکہ حضرت ہاجرہؓ فرعون مصر ملک جبار کی بیٹی تھی یعنی ایک شہزادی تھی اور ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ لونڈی ہی سے کیوں شادی کریں گے کیا ان کے لیے لڑکیوں کی کمی تھی؟ اول تو اس بات میں کوئی حقیقت نہیں کہ وہ لونڈی تھیں اور دوسری بات یہ کہ اگر وہ لونڈی ہی تھیں تو یہ کوئی طعنے والی بات بالکل نہیں بلکہ لونڈی، غلام، آقا سب کے سب اللہ کی مخلوق ہے، یہ گری ہوئی سوچ محض جاہلوں ہی کی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ عرض ہوا کہ اگر وہ کسی پست قوم سے متعلق تھی تو حضرت ابراہیمؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر ان سے بیاہ کیوں کرتے؟ اور اگر ہاجرہ لونڈی ہی تھیں تو پھر سارہ کو ان سے "نجات" پانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر اللہ کے حضور اولاد کے لیے دعائیں کیوں مانگتے رہے اور جب اللہ نے ان کے بطن سے اسماعیلؑ دے دیا تو دوبارہ کبھی اولاد کے لیے دعا نہیں مانگی اور جب تیرہ سال بعد فرشتے نے انہیں حضرت سارہ کے بطن سے ایک اور بیٹے کی خوشخبری سنائی تو حضرت ابراہیم نے خوشی کا اظہار بھی نہیں کیا جیسا کہ کتاب پیدائش میں مذکور ہے؛

"اور ابرام نے خدا سے کہا، کاش اسماعیل ہی تیرے حضور جیتا رہے۔"[40]

حضرت ہاجرہ تو شہزادی تھیں کہ جب فرعون مصر نے حضرت ابراہیمؑ کو اللہ کا نیک اور برگزیدہ بندہ پایا تو انہیں اپنی بیٹی حضرت ہاجرہ نکاح میں دی اور بہت سا مال دولت، نوکر چاکر ان کے ہمراہ کر کے رخصت کر دیا اور جب حضرت ہاجرہ مکہ چلی گئی تو اس کے والد نے مصر سے ہاجرہ کے لیے دریائے نیل سے بحیرہ احمر تک ایک نہر کھدوائی[41]۔ کیا لونڈیوں کے لیے کوئی ایسا سلوک روا رکھتا ہے؟ اور ویسے بھی تورات میں حضرت ہاجرہ کے لیے کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس سے سارہ کی فضیلت ہاجرہ پر ثابت ہو۔ کتاب مقدس میں دونوں کے بارے میں ایک جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن سے اس بات کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ باری تعالیٰ کے ہاں دونوں بھائیوں یعنی حضرت اسحاقؑ و حضرت اسماعیلؑ کی کتنی قدر و منزلت تھی، مثلاً:

"خدا نے نام رکھا سارہ کے فرزند اسحاق کا[42]" اور "خدا نے نام رکھا ہاجرہ کے فرزند اسماعیل کا[43] "

"قوموں اور بادشاہوں کا باپ ہوگا اسحاق"[44] اور "قوموں اور بادشاہوں کا باپ ہوگا اسماعیل[45] "

ابراہیمؑ کی قربان گاہ اور یہودی افکار

یہود کا یہ تصور ہے کہ جہاں قربانی ہوئی وہ مکہ نہیں بلکہ یروشلم ہے، جس کے متعلق بنی اسرائیل کا یہ عقیدہ ہے کہ یہیں پر سے دنیا کی ابتداء ہوئی اور یہیں پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے "اضحاق" کی قربانی دی[46]۔ چونکہ یہود یہاں سے نکالے گئے تھے اس لیے یہود اب یہاں واقع دیوار گریہ Wailing Wall کے پاس آکر روتے اور عبادت کرتے ہیں بلکہ

ان کی عبادت بھی یہی ہے کہ وہ یہاں آکر خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں جلد از جلد اپنا ہیکل واپس کر دیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ مسلمانوں نے ہمارے معبد کے اوپر اپنی مسجد اور یہ گنبد صخرہ تعمیر کی ہے۔

دینیاتی تاریخ کے مطابق یہیں پر اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو دوسرا بیٹا دیا، جس کا انہوں نے اضحاق (اسحاق) نام رکھا۔ اسحاق کی اولاد میں دیگر بیٹوں کے مقابلے میں اسرائیل (حضرت یعقوبؑ) کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ تاریخ نے حضرت یعقوبؑ اور اس کی ابتدائی اولاد کو مقدس یروشلم اور اس کے قرب وجوار کی مبارک سرزمین کے ساتھ کچھ اس طرح جوڑ دیا ہے کہ دونوں لازم ملزوم بن چکے ہیں اور ایک دوسرے سے جدا کر کے ان سے متعلق مطالعہ کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔

ابراہیم علیہ السلام کی قربان گاہ سے ایسا مقصود لینا عقل و نقل کے خلاف ہے اور تاریخی تصورات کو مسخ کرنے کے مترادف ہے، صرف آثار قدیمہ کی بنیاد پر اسلامی تاریخ پر قدغن کرنا تحقیقی اصول کے منافی ہے۔ زمینی حقائق سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ قربانی کی جو عبادت ہے اس کا دنیا میں سب سے بڑا مرکز ہمیشہ سے مکہ ہی ہے۔ وہیں مروہ کی قربان گاہ موجود ہے۔ بیت اللہ، جس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ نے کی، وہ بھی مکہ میں ہے اور اسماعیل کے اولاد کا تعلق اس بیت اللہ کے ساتھ کسی زمانہ میں ختم نہیں ہوا۔ حج و عمرہ کا نظام جس شکل میں حضرت ابراہیمؑ نے جاری کیا تھا، ہزاروں سال گزر جانے کے باوجود ابھی تک وہ نظام موجود ہے۔ اولاد اسحاق کے ساتھ ایسی کوئی محفوظ نشانی نہیں جس سے وہ اپنا تعلق قربانی کے واقعہ یا تعمیر بیت اللہ کے ساتھ ثابت کر سکیں۔

ڈاکٹر خالد مسعود کے مطابق:

> "ذبح کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کے خواب کی حقیقی تعبیر، جو بعد میں ملنے والی آسمانی ہدایات سے واضح ہوتی ہے، یہ تھی کہ بطحاء کی وادی میں وہ ایک خاص معبد اللہ کی عبادت کے لیے تعمیر کریں اور اس کی خدمت اور اس کی حفاظت کے لئے اپنے بیٹے کو اللہ کی نذر کریں تاکہ وہ اس مبارک اور مقدس گھر کی زیارت کے لیے آنے والوں اور زائرین کی عبادت کرنے کے لیے اس معبد کو صاف و پاک رکھیں۔ ایک روایت کے مطابق ایک قدیمی معبد اس وادی میں موجود تھا اور ابراہیمؑ کو اسی قدیمی معبد کو دوبارہ تعمیر کا حکم دیا گیا، لیکن اس روایت کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ پہلے تو قرآن میں "بکہ" کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے وادی میں آبادی کا کوئی وجود نہ تھا، جب حضرت ابراہیمؑ یہاں تشریف لائے تب یہاں رہن سہن کا آغاز ہوا، اور انہوں نے اس وادی کے لئے بابلی زبان کا لفظ منتخب کیا۔ اس لئے اگر پہلے سے یہاں لوگوں کی آبادی ہی نہ تھی تو بیابان میں تعمیرِ معبد کا کوئی مقصد نہیں۔ اسی طرح قرآن نے بیت العتیق (قدیمی گھر) بیت اللہ ہی کو کہا ہے، اور قرآن نے اول بیت وضع للناس اس کو پہلا گھر کہا ہے۔ اسی طرح اس کو "مقام ابراہیم (ابراہیم کا مسکن)" بھی کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان الفاظ میں جس اولیت اور قدامت کا ذکر ہوا ہے، وہ یروشلم میں موجود بیت المقدس کے مقابلہ میں ہے جو صدیوں بعد سلیمان علیہ السلام کے عہد حکومت میں تعمیر ہوا اور یہود کے ہاں اس کو قبلہ کی حیثیت حاصل ہوئی[47]۔"

قبلہ کی تاریخ اور یہودی تصورات

مسجد اقصیٰ کی اہمیت اسلام میں اس لحاظ سے بھی اجاگر اور منفرد ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا قبلہ خانہ کعبہ رہا۔ بالخصوص بنی اسرائیل کے جد امجد ہی نے اس کو حضرت آدمؑ کے رکھے گئے بنیادوں پر از سر نو تعمیر کیا جیسا کہ قرآن میں ہے :

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ[48]

"اور جب اٹھائے ابراہیم اور اسماعیل نے (مکہ میں) بیت اللہ (خانہ کعبہ) کی بنیادیں۔"

تمام انبیاء بشمول انبیائے بنی اسرائیل کا قبلہ بیت اللہ تھا۔ اس لیے یہودیوں کا قبلہ بھی از روئے دین اسلام شروع سے ہی بیت اللہ ہے۔ اور اسی کا حج کیا کرتے تھے۔ یہودیوں کا یہ دعوی ہے کہ ہیکل سلیمانی ان کا قبلہ ہے۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے کہ جس کی کوئی ٹھوس دلیل ان کے پاس نہیں ہے۔ کیونکہ ایک ہی وقت میں دو متوازی قبلوں کا وجود خود مقصد قبلہ کے خلاف ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب بیت اللہ کی تعمیر مکمل کی تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آواز لگائی۔

وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ---- يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ[49]

"اور (اے ابراہیم) لوگوں میں حج کا اعلان عام کر۔ وہ تیرے پاس آئیں گے پیدل اور دبلے اونٹوں پر اور ہر ایک راستے سے آئیں گے۔"

یہاں پر قرآن میں لفظ "الناس" کا ذکر ہے۔ جس میں دنیا کے تمام لوگ شامل ہیں، اب اس میں ظاہر ہے بنی اسرائیل بھی آ گئے۔ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد یعنی حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا قبلہ بھی خانہ کعبہ ہی تھا کیونکہ وہ اپنے باپ ابراہیمؑ کے دین پر تھے۔ اگر مان بھی لیا جائے کہ بعد میں حضرت سلیمانؑ نے ہیکل سلیمانی کے نام سے یہودیوں کے لیے ایک علٰحیدہ قبلہ تعمیر فرمایا تو سوال یہ ہے کہ کیا منحرف شدہ کتاب مقدس سے ہی صحیح، کوئی ایک دلیل وہ پیش کر سکتے ہیں؟

در حقیقت، بیت المقدس کی حیثیت نہ تو حرم کی ہے اور نہ ہی یہ یہودیوں کا قبلہ رہا ہے، بیت المقدس کو اپنا قبلہ قرار دینا یہودیوں کی اختراع ہے۔ انہوں نے اپنی طرف سے اسے اپنا قبلہ کہنا شروع کر دیا تھا تو مشہور ہو گیا کہ یہ اہل کتاب کا قبلہ ہے، البتہ یہ مسلمانوں کا قبلہ اول ضرور تھا کیونکہ ہجرت مدینہ کے بعد مسلمانوں نے سولہ، سترہ ماہ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی تھی[50]۔

استحقاقِ یروشلم پر یہودی تصورات کی حقیقت

کتاب مقدس کے مطابق چونکہ اس شہر کی تعمیر حضرت داؤدؑ کے ہاتھوں سرانجام پائی تھی اس لئے یہ داؤدی شہر Davidic City کے نام سے مشہور ہوا۔ اس بات سے استدلال کرتے ہوئے یہود کہتے ہیں، کہ اس شہر کی بنیاد حضرت داود علیہ السلام نے رکھی ہے اس لئے یہ ہمارا حق ہے۔ اس لئے پہلے حضرت داودؑ کی خدمات اور اس کے بعد یہودی فکر کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

کتابِ مقدس کی متعدد عبارات سے یہی واضح ہوتا ہے کہ سموئیل نبی کے زمانے میں جب حضرت داؤدؑ نے جالوتی طاقتوں کو شکست دی تب ساؤل (طالوت) کی وفات کے بعد اسے اسرائیلی قبائل کا بادشاہ بنایا گیا۔ کتابِ مقدس کے مطابق بعد میں داؤدی خاندان اور ساؤل کے خاندان کے درمیان مسلسل خانہ جنگی ہوتی رہی جس کے نتیجہ میں ساؤل کا خاندان کمزور بن گیا[51]۔ کتابِ مقدس کے مطابق اب حضرت داؤدؑ کی طاقت میں اضافہ ہو چکا تھا اور انہوں نے کوہ صیہون کے اوپر اور اس کے آس پاس میں یروشلم شہر کی داغ بیل ڈالی۔ یہیں پر ان کے ہاں حضرت سلیمانؑ اور دیگر بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب حضرت داؤدؑ نے فلستیوں پر مکمل فتح حاصل کی۔ انہوں نے پہلی بار تابوتِ عہد (Arck of Covenant) خدا کے حکم سے یروشلم میں رکھا[52]۔

یہیں سے یروشلم شہر نے اپنی شہرت اور ارتقاء کا آغاز کیا اور یہی وہ زمانہ تھا جب حضرت داؤدؑ نے اپنی سلطنت کو بحر روم کے ساحل اور مشرق میں دمشق اور موآب کے پہاڑیوں تک وسیع کیا۔ حضرت داؤدؑ کے زمانے میں اب یروشلم کا کنعانی علاقہ ایک چھوٹی سی ریاست کے بجائے ایک بڑی ریاست میں تبدیل ہو چکا تھا۔ کتاب مقدس کے مطابق حضرت داؤدؑ نے اپنے دور میں تابوت عہد کو بڑی شان و شوکت کے ساتھ یروشلم منتقل تو کیا تھا[53]، تاہم انہوں نے کوئی پر شکوہ معبد تعمیر نہیں کیا تھا بلکہ پرانے طرز کا خیمہ اور مسکن خداوندی ہی مسجد کہلاتی تھی۔ کتاب مقدس کے مطابق خود اللہ تعالیٰ نے ناتن، حضرت داؤدؑ کے بھائی کے ذریعہ پیغام بھیجا تھا کہ اس کے رہنے کے لئے الگ گھر بنائے کیونکہ قنوت سے لیکر اب تک وہ پردہ دار خیمہ اور مسکن میں رہ رہا ہے۔ کتاب مقدس کے مطابق خدا بار بار حضرت داؤدؑ کو لکڑی کے معبد کے بنانے کی تاکید کر رہا تھا[54]۔ خدا نے حضرت داؤدؑ کو یہ بھی بتایا کہ وہ دن بھی آئے گا کہ اس کے جانشین اس کے لئے ایک گھر تعمیر کریں گے جس کی برکت سے ان کی سلطنت ہمیشہ قائم و دائم رہے گی[55]۔

کتاب مقدس کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یروشلم حضرت داؤدؑ کے زمانے میں پر شکوہ تو تھا لیکن انہیں یہ فرصت نہیں ملی کہ خداوند کے گھر کو خیمہ اجتماع کے روایتی ساخت کے مقابلے میں عالی شان ہالوں، گنبدوں، محرابوں، ڈیوڑھیوں اور فلک بوس مساکن میں تبدیل کر سکیں اور یوں حضرت سلیمانؑ کو آخری وصیتیں کر کے 40 سال تک فتوحات کی ایک سرگرم زندگی گزارنے کے بعد بالآخر فوت ہوئے اور یروشلم ہی میں آپ کو مدفون کیا گیا۔[56]

ان تاریخی تصورات کی بنیاد پر یہودیوں کا خیال ہے کہ اس کی بنیاد داودؑ نے رکھی ہے، اس لئے یہ ہمارا حق ہے، لیکن اس کی تردید خود ان کے ماہرین آثار قدیمہ نے کیا، 1865ء میں برطانیہ نے برٹش رائل انجینئرز کا کیپٹن ولسن کو یروشلم بھیجا، اس نے مختلف مقامات پر کھدائی کی لیکن بقول سلبرمین وہاں ایسا کچھ نہ ملا جس کی بنیاد پر کہا جائے، کہ اس شہر کا تعلق محض یہودیوں سے ہے، 1910ء میں ڈومی نیکا کے ماہر آثار قدیمہ ہیوز ونسٹ نے بھی کھدائی کی، اس نے بتایا کہ یروشلم کی تاریخ

حضرت داؤدؑ سے بھی پہلے کی ہے[57]۔ چنانچہ یہ دعوٰی کرنا کہ اس شہر کے اصل حقدار یہودی ہیں، ناقابل تسلیم سا لگتا ہے، جیسا کہ کیرن آرم سٹرانگ کہتی ہیں:

"It was not possible, therefore, to claim that the city belonged to the Jews because they had been there first. Indeed, the Bible went out of its way to show that the Israelites had taken both Palestne and Jerusalem from the andigenous population. Modern archeology could therefore threaten some of the simple certainties of faith[58]."

"اس لیے یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے کہ یہودی اس مقدس شہر پر اپنا دینو قانونی حق جتاتے ہیں کیونکہ ان کی واپسی تو قبل مسیح میں مکمل ہو گئی ہے اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان کی پوری تاریخ اور دینیاتی ادب میں بیسویں صدی عیسوی تک کوئی اس قسم کا دعویٰ پڑھنے کو بھی نہیں ملتا۔"

یہود کے مبنی بر حسد تصورات

در حقیقت یہود کے تصورات حسد و بغض پر مبنی ہیں، چونکہ ان کا خیال ہے کہ کائنات میں ہم افضل تھے تو اب بنی اسماعیل میں کیوں کر کوئی افضل آئے؟ ان کے اس حاسدانہ رویہ کا اللہ تعالٰی نے بھی قرآن میں سختی سے تردید کی ہے کہ اگر یہود خود کو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کہتے ہیں تو کیا حضرت محمد ﷺ ان کے جد امجد حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے نہیں ہیں[59]؟ مفسر قرآن علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے مطابق کہ کیا یہود رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہ کرام پر اللہ کے احسان وانعام کو دیکھ کر حسد میں مر جاتے ہیں سو یہ تو بالکل ان کی بے ہودگی ہے کیونکہ ہم نے حضرت ابراہیمؑ کے گھرانے میں کتاب علم اور سلطنت عظیم عنایت کی ہے۔ پھر یہود آپؐ کی نبوت اور عزت پر کیسے حسد اور انکار کرتے ہیں کہ آپؐ بھی تو ابراہیمؑ ہی کے گھرانے میں سے ہیں[60]۔

آپؐ کے متعلق نہ صرف قرآن مجید بلکہ کتاب مقدس میں بھی ذکر ملتا ہے۔ کتاب مقدس کے مطابق، وہ فاران کی کوہ سے جلوہ افروز ہوا اور وہ لاکھوں قدسیوں میں سے آیا، اس کے داہنے ہاتھ پر آتشی شریعت تھی، اور وہ بے شک اقوام سے محبت رکھتا ہے[61] الغرض ایسی بہت ساری پیش گوئیاں بائبل میں بھی مذکور ہیں جن کو دیکھ کر صاف دکھائی دیتا ہے کہ ان سے مراد آپؐ ہی ہیں، ان تمام کا احاطہ یہاں مشکل ہے۔

ارضِ موعودہ کی حقیقت

یہودیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ تعالٰی نے ان کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ انہیں یروشلم یعنی بیت المقدس واپس لا کر دے گا اور وہ اس سلسلے میں جہاں کتاب مقدس کے حوالے پیش کرتے ہیں جو یقیناً محرف شدہ ہیں لیکن وہاں وہ قرآن مجید

جیسی لاریب کتاب کا حوالہ بھی پیش کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں فرمایا ہے:

وَقُلْنَا مِنْ بَعْدِهِ لِبَنِي إِسْرَائِيلَ اسْكُنُوا الْأَرْضَ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيفًا [62]

"اور بنی اسرائیل کو ہم نے کہا کہ زمین میں جہاں چاہو رہو سہو، پس آخری وقت کے آنے پر، ہم تم سب کو واپس لا کر جمع کریں گے۔"

انہیں اللہ نے فرمایا ہے کہ آخری زمانے میں انہیں ساری دنیا سے بہر حال اللہ تعالیٰ چن چن کر یروشلم ضرور لے کر آئے گا تاہم یہاں وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ خدا نے یہ بھی فرمایا ہے:

فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ [63]

اور جب آخری وقت آئے گا تو بنی اسرائیل کو ان کے سرکشی کا پوری سزا دے گا۔ان آیات کی تفسیر میں گرچہ اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد حشر اور قیامت کا دن ہے، لیکن چونکہ یہودیوں کی واپسی ابھی بیت المقدس (یروشلم) کو ہوئی نہیں تھی اس لیے شاید مفسرین نے ایسا لکھا ہو، اب جبکہ ان کی واپسی ہو رہی ہے ارض مقدسہ کو، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد یہی واپسی ہے جو قبل از وقت ہو رہی ہے، لیکن ان کی یہ واپسی بھلائی کے لیے نہیں بلکہ یہودیوں کی تباہی کے لیے ہو رہی ہے۔ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں:

" اکثر و بیشتر مفسرین نے وَعْدُ الْآخِرَةِ سے آخرت یعنی قیامت مراد لی ہے۔۔۔۔ لیکن میرے خیال میں ان الفاظ میں یہ اشارہ بھی ہے، کہ جب آخرت کا وقت آئے گا تو یہودیوں کو ہر کہیں سے اکٹھا کر کے ایک جگہ جمع کر لیا جائے گا۔ یہ لوگ حضرت عیسیٰ کی تکذیب کر کے بہت بڑے جرم کے مرتکب ہو چکے ہیں۔اس کے بعد نبی آخر زمانؐ کی رسالت کو جھٹلا کر انہوں نے اپنے اس جرم کی توثیق بھی کر دی۔ چنانچہ اب اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس قوم کی حیثیت اس قیدی کی سی ہے جس کو اس کے جرم کی سزا سنائی جا چکی ہو مگر اس سزا کی تعمیل (Execution) ابھی باقی ہو۔۔۔۔۔۔ پچھلی صدی تک بھی ان کی کیفیت ایسی تھی کہ یہ لوگ پوری دنیا میں بکھرے ہوئے تھے چونکہ کسی اجتماعی سزا یا عذاب کے لیے ان کا ایک جگہ جمع ہونا ضروری تھا اس لیے قدرت کی طرف سے اسرائیل کی ریاست کا قیام عمل میں لایا گیا اور آیت زیر نظر کے الفاظ کے عین مطابق دنیا کے کونے کونے سے تمام یہودیوں کو اکھٹا کر کے یہاں آباد کیا گیا۔اب اپنے زعم میں تو ان لوگوں نے عظیم تر اسرائیل (Greater Israel) کا منصوبہ تیار رکھا ہے۔۔۔ مگر بالآخر یہ عظیم تر اسرائیل ان کے لیے عظیم تر قبرستان ثابت ہو گا۔آخری زمانے میں حضرت عیسیٰ تشریف لائیں گے اور آپؑ کے ہاتھوں ان کی ہلاکت ہو گی [64]۔"

حالانکہ ان کی واپسی اس وقت پوری ہو چکی تھی جب یہ بابل سے واپس آئے جیسا کہ اس ضمن میں فنڈلے نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مقدس یروشلم پر اسرائیل کی شکل میں یہودی قبضہ یقیناً غیر دینیاتی ہے۔اس نے ڈاکٹر ڈیوی ہیگل کے لیکچر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے:

"The prophesied return of the nation of Israel to Palestine was fulfilled by the biblical return from Babylon and has nothing to do with twentieth century Israel[65]. "

"اسرائیل کا فلسطین کی طرف واپسی (جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے) اس وقت پوری ہو چکی تھی جب یہ لوگ بابل سے واپس ہوئے نہ کہ اب بیسویں صدی عیسوی میں یہ وہاں جانے کے دعویدار نظر آرہے ہیں۔"

حاصل بحث

یروشلم کے متعلق یہودیوں کا یہ دعویٰ بظاہر سہانا اور معقول لگتا ہے کہ کتاب مقدس میں ان کے ساتھ جو خدائی وعدہ کیا گیا تھا اسی کی تکمیل کے لیے ان کی کاوشیں جاری ہیں۔ تاہم کمال کی بات یہ ہے کہ یہودیوں کا مقدس شہر یروشلم پر استحقاق ملکیت کا دعویٰ بیسویں صدی عیسوی سے پہلے بالکل مفقود ہے اور اس انتہائی اہم امر کے متعلق ان کے اسلاف کو قطعاً کوئی خبر تک نہیں تھی، کیونکہ حقیقت میں ایسی کوئی بات تھی ہی نہیں۔ اس ضمن میں اگر وہ اپنی دینیات کا مطالعہ کریں تو خود ان کی اپنی تاریخ بتاتی ہے کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں ان کو یہاں سے غلاموں کی طرح نکالا گیا اور پھر نوے سال بعد یہ شاہِ ایران کے زیر سایہ محکومانہ انداز میں واپس ہوئے تھے۔ ایسے میں کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ صدیوں محکوم رہنے والی قوم اب حاکمیت کی دعویدار بن گئی؟ اور تو اور حضرت مسیحؑ بھی دیگر انبیاء بنی اسرائیل کی طرح اس وقت مبعوث ہوئے جب یہ مقدس شہر مشرک رومیوں کے زیر تسلط تھا۔ آئندہ پانچ صدیوں تک یہ شہر رومیوں کے پاس رہا جہاں خود یہودیت کی حالت گزران ایسی تھی جیسا کہ ہندوستان میں طبقہ شودر کی۔ اس دوران ان کا معبد کوڑا کرکٹ کا ایک ڈھیر بن چکا تھا۔ چونکہ انہوں نے خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی ناقدری کی تھی، لہٰذا ایسے میں ان کے ہاتھوں سے یہ خدائی معبد چلا گیا اور یہ ایک خدائی فیصلہ تھا کہ ارض مقدسہ جیسا خدائی تحفے کی ناقدری اور مقدس شہر کی حفاظت کے متعلق یہودیوں کی عدم استطاعت اور غفلت کی بنا پر مقدس سرزمین ان کے کمزور ہاتھوں سے لے کر مظبوط ہاتھوں میں منتقل کر دیا جائے تاکہ یہ سلامتی والا شہر سلامت ہاتھوں میں رہے اور جو اس کے تحفظ اور امن وامان کے امین ہوں، ان کے پاس یہ خدائی تحفہ سلامت رہے۔ ویسے بھی یہ ایک دنیوی دستور ہے کہ اگر ایک عم زاد بھائی اپنے دادا کی وراثت کی حفاظت نہیں کر سکتا تو یہ دوسرے عم زاد بھائی کو منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے ہاتھوں اس شہر کا آجانا اسی بات کی غمازی کرتا ہے۔ تاریخی حقائق بتاتے ہیں کہ یہودیوں نے کبھی بھی اس شہر کا دفاع نہیں کیا اور جب یہ شہر مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوا تو زبور اور قرآن میں وارد وعدۂ خداوندی کی تکمیل ہوئی کہ نہ صرف مقدس سرزمین بلکہ پورا کرۂ ارض صالح بندوں کی میراث میں دے دیا جائے گا۔ اس ضمن میں خوب ذہن نشین کر لینے والی بات یہ ہے کہ اگر اسلام گزشتہ شریعت موسوی کو موقوف کر سکتا ہے تو کیا بزعم یہود حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ اولاد اسحاقؑ کے حق میں کئے گئے بائبلی وعدہ کو موقوف نہیں کر سکتا؟ دلچسپ بات یہ ہے

کہ مقدس شہر بارہ سو سال سے زیادہ عرصہ اسلام کے قبضہ میں رہا جب کہ مسیحی رومیوں کے زیر تسلط اس کا دور رانیہ صرف تین سو سال رہا۔تاہم یہ اسلام سے پہلے کی بات ہے پھر صلیبی جنگوں کے نتیجہ میں کچھ عرصہ یہ شہر مسیحیت کے چنگل میں رہا اور پہلی جنگ عظیم کے اختتام سے لے کر قیام اسرائیل تک بھی یہ مقدس سرزمین برطانوی انتداب میں رہا یعنی مسیحیوں کے ہاتھ میں رہا۔اور قیام اسرائیل سے لے کر عصر حاضر تک یہودی قبضہ چلا آرہا ہے جو قریباستر سال پر محیط عرصہ ہے۔تو اسلام کے آنے کے بعد بارہ سو سال تک یہ شہر اسلام کے ہاتھوں میں رہا،ایک سو بیس برس مسیحیوں اور ستر برس یہودیوں کے قبضہ میں رہا۔ایک غیر جانبدار محقق خود اندازہ لگا سکتا ہے کہ کس کے دور میں اس اسم با مسمیٰ شہر یعنی سلامتی والے شہر میں "امن" رہا ہے؟اسلامی دور حکومت میں یہودیوں اور مسیحیوں کے لیے بھی مکمل عدل وانصاف تھا جب کہ مسیحیوں کے دور میں مسلمانوں کو تو کیا یہودیوں کو بھی امن نصیب نہ تھا۔اسی طرح یہودیوں کے عہد حکومت میں آج وہاں کوئی بھی غیر یہودی محفوظ نہیں۔ایسے میں ان کا دعویٰ کیسے درست ہو سکتا ہے کہ العیاذ باللہ،خدا ان کے ساتھ وعدہ کر کے امن والے اس مقدس شہر کو انہیں سونپ کر "بدامن" شہر بنائے؟

حواشی وحوالہ جات

1 https://en.wikipedia.org/wiki/Menachem_Beginaccessed 11 May 2018

2 ایف ایس خیر اللہ، قاموس الکتاب (لاہور: مسیحی اشاعت خانہ، 1993ء) ص1112

3 پیدائش،18:14

4 قاموس الکتاب، ص1112

5 اور جب یروشالیم کے بادشاہ ادونی صدق نے سنا کہ یشوع نے عی کو سر کر کے اسے نیست و نابود کر دیا۔(یشوع، 10:5)

6 عزرا،8:4

7 قاموس الکتاب، ص1112

8 نفس مصدر

9 پیدائش،31: 18

10 نفس مصدر 17: 8-9،

11 پیدائش 12: 6-7

12 گنتی،32: 19-22

13 قاموس الکتاب، ص1112

14 رومیوں، 17:15، 25، 26، 31

15 کرنتھیوں، 3:16

16 گلتیوں، 17:1، 18، 4 : 25، 26

17 2 سلاطین، 19:21

18 عبرانیوں، 12:22، مکاشفہ؛ 3:12

19 2 سموئیل، 5:7، 6

20 یسعیاہ، 60:14

21 مذکور، 2:3

22 زکریا، 8:30

23 یسعیاہ، 27:13

24 مذکور، 47:13

25 مذکور، 48:2

26 مذکور، 60:13

27 سورۃ المائدۃ 5: 21

28 امام بخاری، ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، (بیروت: دار طوق النجاۃ، 1422ھ) حدیث (2940)

29 صحیح البخاری، حدیث (3176، 3886)

30 ابو عبداللہ واقدی، فتوح الشام (بیروت: دار الکتب العلمیہ، 1997ء) ص378

31 سورۃ الاعراف 7: 137

32 پیدائش، 17 : 7-8

33 مذکور، 31:11

34 مذکور، 2 1:1-7

35 سورۃ آل عمران کی آیت 23 کے تحت امام قرطبیؒ حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت ذکر کرتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ کے نزول کا سبب یہ ہوا کہ نبی کریمؐ نے ایک بار یہود کی ایک جماعت کو دعوت دی تو انہوں نے آپؐ سے پوچھا کہ آپ کس دین پر ہیں؟ آپؐ نے

فرمایا کہ دین ابراہیمی پر۔ تو اس پر انہوں نے کہا کہ ابراہیم تو دین یہود پر تھے، تو آپؐ نے ان سے فرمایا کہ آؤ! تورات دیکھتے ہیں، وہی ہمارے درمیان یہ فیصلہ کرے ۔ تو انہوں نے تورات کی طرف جانے سے انکار کر دیا۔(قرطبیؒ،ابوعبداللہ محمد بن احمد شمس الدین،الجامع لاحکام القرآن(بیروت: دار صادر 1407ھ)4: 50)

36 پیدائش،22: 2-15

37 مذکور،16: 1-2،25: 12

38 مذکور،21: 9-12

39 پیدائش،21: 13

40 مذکور،17: 18

41 مذکور ، 12: 20، 20: 15

42 مذکور ، 17: 19

43 مذکور ، 16: 11

44 مذکور ، 17: 6

45 مذکور ، 25: 16

46 Delaney, Card, Abraham on Trail; The Social Legency of Biblical Myth, (New Jercey: Princeton University Press, 2000.), p.120

47 ڈاکٹر خالد مسعود، سیرۃ النبی ﷺ، ماہنامہ الاشراق، جنوری 2006ء، ص 13

48 سورۃ البقرۃ 2: 127

49 سورۃ الحج 22: 27

50 صحیح البخاری ،حدیث(4492)

51 سموئیل 2،1:3

52 مذکور،2،5: 25،6: 3،1

53 مذکور،2،1:6،8

54 مذکور ،2،7،1:7

55 مذکور ،2،12:7،14

56 سلاطین 1، 1:2، 10-12

57 Asher, Silberman Niel, Digging for God and Country; Exploration, Archeology and Struggle for the Holy Land, 1799-1917. (New York: 1982), p. 185.

58 Karen Arm Strong, Jerusalem; One City Three Faiths, (New York: 2014), p. 362.

59 سورۃ النساء 4: 54

60 علامہ شبیر احمد عثمانی، تفسیر عثمانی (کراچی: دار الاشاعت، 2007ء) ص 411

61 اس سے قبل یہ فقرہ ہے؛ خداوند سیناسے آیا اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا۔ (استثناء، 33: 1-2)

62 سورۃ الاسراء 17: 104

63 سورۃ الاسراء 17: 104

64 ڈاکٹر اسرار احمد، تفسیر بیان القرآن (لاہور: قرآن اکیڈمی، 2008ء) 4: 334-335

65 Findely, Paul and They Dare to Speak Out: People and Institutions confront Israel Lobby, (Lawerance Hill Books, N.D). p.245